

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

مذہب کے عروج و زوال کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے ارتقاء اور انحطاط کی کڑیاں اگرچہ مختلف واقعات و حادثات سے عبارت ہیں مگر ان میں چند کڑیاں بہر حال ایسی ہیں جو قریب قریب سارے مذہب کی تاریخ میں مشترک نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے مذہب عروج و زوال کے جن مراحل میں سے گزرتے ہیں وہ قریب قریب ایک جیسے ہیں۔

ان مراحل کی نشاندہی کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ مذہب فی الحقیقت کیا چیز ہے۔ اس کا آغاز کیونکر ہوتا ہے اور اُسے زوال کیوں آتا ہے۔ مذہب دراصل نام ہے اُن اُن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لانے کا، جو اگرچہ انسان کے مشاہدے کی حدود سے باہر ہیں تاہم جن کی تصدیق عقل سلیم سے ہوتی ہے اور جو انسانی روح کو تسکین دینے کا سامان فراہم کرتی ہیں اور اُسے حیوانیت یا مادہ پرستانہ طرز عمل سے بلند کر کے اخلاقی اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تحریک اس میں پیدا کرتی ہیں۔ یہ مذہب کی ایک ایسی تعریف ہے جس میں اس کے سارے اجزاء آجاتے ہیں۔ اس کے مطابق مذہب روح کی بالیدگی، فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی پاکیزگی اور انبانے نوع بلکہ ساری مخلوق کی خیر خواہی کا دوسرا نام ہے۔ پھر اس تعریف کے مضمرات پر غور کرنے سے یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ مذہب مادی زندگی کی ضد نہیں بلکہ مادہ پرستانہ طرز فکر اور طرز عمل کی ضد ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان مذہب کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے۔ اس کا

سادہ سا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان ایک ذی روح مخلوق ہے اس لیے وہ مادی علاقہ میں گرفتار ہونے کے باوجود اپنی رُوح کی تسکین کے لیے بے تاب رہتا ہے اس لیے وہ کسی نہ کسی مذہب کو اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ روحانیت اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان جب تک اپنے اندر روح رکھتا ہے وہ مذہب سے کسی طرح چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس جواب میں اُس مقصد کی بھی نشاندہی موجود ہے جس کے لیے مذہب دنیا میں موجود ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسان کے خوب و ناخوب کے پیمانے صرف مادی شہ و ذریاں کو سامنے رکھ کر بنائے جائیں مگر انسان ہزاروں دعوؤں کے باوجود اس بات پر آج تک آمادہ نہیں ہو سکا کہ اُس کی پوری زندگی مادی اقدار سے عبارت ہو اور وہ زندگی کے ہر معاملے کو صرف مادی نفع و نقصان سے حل کرے۔ وہ قومیں جنہیں آج اپنی مذہب بیزاری پر بڑا ناز ہے اور جنہیں اس نعش کو ٹھکانے لگانے کا بڑا دعویٰ ہے وہ بھی اس سے پوری طرح گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکیں۔ اُن کے ہاں بھی مرد کا اپنی ماؤں بہنوں سے شادی کرنا سخت ناقابل تصور اور ناقابل برداشت ہے۔ اور انسانی لاشیں جن کی ہڈیوں اور خون سے بہت سے مالی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اُن سے یہ فائدے حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ انہیں زمین میں دفن کر کے معاشی نقطہ نظر سے قومی زیاں کیا جاتا ہے۔

مذہب جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے انسان کی کوئی مادی ضرورت نہیں بلکہ اس کی روحانی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے وقت جہاں اُس کی مادی ضروریات کی فراہمی کا التزام کیا وہاں اُس کی اس روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دینِ حق پہنچانے کا انتظام فرمایا۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ بنیادی طور پر باطل معلوم ہوتا ہے کہ مذہب چند اسباب اور حالات کا نتیجہ ہے اور اسے کسی دور کے مخصوص تقاضے جنم دیتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ کے مطابق مذہب حالات کی پیداوار نہیں بلکہ یہ حالات کو ایک خاص نہج پر ڈھالنے کے لیے دنیا میں نازل کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہدایتِ الہی کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے وہ اس کی پوری طرح تصدیق کرتا ہے:

فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو

هُدَاىَ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے
کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

یہاں ہدایت سے متعلق دونوں امور یعنی ہدایت پہنچانے اور ہدایت کی پیروی کرنے کے ساتھ باری
تعالیٰ نے واحد منظم کا صیغہ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت جو انسان کو اخروی خوف سے
نجات دلا سکتی ہے وہ صرف وہ ہدایت ہے جو باری تعالیٰ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے دی گئی ہے۔
چنانچہ یہ ہدایت کسی عصری تقاضے یا کسی ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ جس قدر مطلق نے انسان کو پیدا کیا، اُس نے
اسے اس گمراہی پر اتارتے ہی اس کے رشد و ہدایت کا التزام فرمایا۔

اسلام کے سطح بین نقاد ہدایت کے متعلق اس کے اس اساسی تصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور باطل
فلسفوں کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو انسان کی مادی ضروریات نے جنم دیا
ہے اور ان اختیاجات کے تبدیل ہونے کے ساتھ مذہب بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے برعکس اسلام
ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہدایت کا مرکز حتمہ باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و بہبود کا راز صرف اس چیز میں مضمر
ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اُس کے مطابق ڈھالے۔ اس حقیقت کو دوسرے نغظوں میں یہ
کہا جاسکتا ہے کہ انسان جو کچھ تغیر و تبدل کرتا ہے وہ ماحول میں کرتا ہے۔ وہ ہدایت الہی میں کسی قسم کی
تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کے من مانے تغیرات کو شرک سے تعبیر کیا ہے چنانچہ
سورہ توبہ میں ارشاد ہے:

اتَّخَذُوا أَعْبَادَهُمْ رُءُوسًا
مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَاللَّيْسَ لِمَنْ يَشْرِكُ بِاللَّهِ
أَمْرٌ إِلَّا لِيُعْجِبَهُ وَاللَّهُ وَاحِدٌ
إِلَّا اللَّهُ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا
رب بنا لیا ہے، اسی طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھی
حالانکہ ان کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ
تھا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی بندگی
کے لائق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں

ترندی میں روایت ہے کہ جب حضرت عدی ابن حاتم علیہ السلام کو خیر باد کہہ کے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو آپ نے بارگاہ رسالت میں جو مختلف سوالات پیش کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید کا جو یہ ارتداد ہے کہ انہوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے حضور نے اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جس چیز کو حلال کہہ دیتے تم اُسے حلال جان لیتے اور جس کے بارے میں حرمت کا فیصلہ کر دیتے تم اُسے حرام مان لیتے۔ بس یہی ان کو اپنا رب بنا لینا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا حکم دینا باری تعالیٰ کا کام ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے اس حق کو مخلوق کے ایک طبقے کو سونپ دیا تھا۔

پھر سورہ انعام میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و کامرانی کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ اس ہدایت کی پیروی کرے۔

قُلْ اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى وَ
اٰمٰنًا نَسْلَمَ لِيَّوْبِ الْعٰلَمِيْنَ - (۷۱)
آپ کہہ دیجیے کہ صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی
رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے
کہ مالکِ کائنات کے آگے سر خم کر دو۔

سورہ اعراف میں ہدایت الہی کی پیروی کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس ہدایت کے علاوہ کسی دوسرے نظریے یا کسی دوسرے فلسفے یا کسی دوسرے طرز عمل کو اپنانا اپنے آپ کو بڑی ہی میں مبتلا کرنا ہے۔

اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى وَ
لَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهِ اَوْلِيَاءَ - (۳)
اُس ہدایت کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی
طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ اور اپنے
رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو
مِنْ دُوْنِهِ میں ضمیر دَبِكُمْ کی طرف لڑتی ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو
مطاع نہ بناؤ۔

اولیاء کا لفظ بڑا جامع ہے اور اس میں ہر قسم کے سرپرست، متولی اور مددگار شامل ہو جاتے

ہیں جن کی طرف انسان رشد و ہدایت کے لیے رجوع کرتا ہے اور وہ اُسے غلط راستوں پر لے جاسکتے ہیں انسان عام طور پر دو طبقوں سے متاثر ہو کر گمراہ ہوتا ہے۔

د، مذہبی اور دینی طبقہ۔ چونکہ انسان کو اس طبقے پر بڑا اعتماد ہوتا ہے اس لیے یہ بڑی آسانی کے ساتھ سادہ لوح عوام کے ذہنوں میں گمراہی کے جراثیم داخل کر سکتا ہے۔ یہ طبقہ عام طور پر نیکی اور تقدیس کی آڑ میں شکار کھینتا ہے اور اپنے ذاتی خیالات و افکار کو اور اپنے دلپسند نظریات کو ہدایت الہی کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کر کے انہیں ان کی پیروی کی دعوت دیتا ہے اور جو لوگ اس کی ان خرافات کو صدق دل سے قبول کر لیں انہیں جنت کی بشارتیں دیتا اور انکار کرنے والوں کو دوزخ کے عذاب ڈراتا ہے۔ اس طبقے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

ر ب، دوسرا طبقہ معاشرے کے بااثر افراد پر مشتمل ہے۔ اس طبقے میں اصحاب اقتدار، اصحاب ثروت یا سوسائٹی کے دوسرے قائدین شامل ہیں جن کی قیادت اور رہنمائی میں لوگ بالعموم چلتے ہیں اور جن کی آراء معاشرے میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ یہ حضرات اقتدار یا دولت و ثروت کے بل بوتے پر عوام میں اپنے گمراہ کن نظریات پھیلائے رہتے ہیں اور اگر وہ انہیں قبول کرنے میں متامل ہوں تو پھر ان پر مختلف حیلوں بہانوں سے عرصہ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے جس جماعت کے لیے الملائہ کا لفظ استعمال کیا ہے وہ یہی طبقہ ہے۔ ائمہ لغت نے اس کے جو معنی بیان کیے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبقہ ایسے بااثر لوگوں پر مشتمل ہے جن سے عوام یا تو ذہنی طور پر مرعوب ہوں یا ان کی بسبب اور جلال سے خوفزدہ ہو کر ان کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے پر مجبور ہوں۔ اس طبقے میں مفکرین، شعراء، ارباب، صنعت و تجارت کے نگران اور زمام اقتدار کو سنبھالنے والے حضرات شامل ہیں۔ فلسفی، شاعر اور ارباب باطل افکار و نظریات کے طلسم سے لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر کے انہیں حق و صداقت کے راستے سے ہٹاتے ہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار روپے پیسے کے زور سے کسی معاشرے میں ثروت و فساد پھیلاتے ہیں اور ارباب اختیار اپنے وسیع اختیارات کے ذریعہ اپنے غلط تصورات کے مطابق سوسائٹی کو غلط راستے پر چلاتے ہیں۔

اللہ کے دین سے بغاوت اور سرکشی کی ایک بڑی وجہ نفس کی بندگی بھی ہے۔ انسان یا اوقات خارجی رہاؤ کے تحت نہیں بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کے تحت راہِ حق کو خیر یا کوہر کر ظلمت اور گمراہی کے راستے کو اختیار کرتا ہے۔ خواہشِ نفس کی پیروی کرنے والوں کی محرومی اور بربادی کا اعلان قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے :

اور ان کے زیادہ گمراہ اور ٹھٹھا ہوا کون ہے جو اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنی خواہشات کی پیروی کریں۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ - (قصص - ۵۰)

اور سورہ فرقان میں فرمایا گیا :

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ لَقَدْ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكَيْلًا - أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ - إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا - (۴۴)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کی اصل وجہ حق کو پہچاننے میں عقل کی عاجزی اور در ماندگی نہ تھی بلکہ محض اتباع ہوائے نفس تھی اور اسی بنا پر یہ لوگ نہ تو عقل کی کوئی بات سوچتے تھے اور نہ نصیحت اور خیر خواہی کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ انہیں قرآن مجید نے جانور یا جانوروں سے بھی بدتر اس لیے کہا ہے کہ جس طرح جانور اپنی خواہش کی پیروی میں جس کھیت میں چاہتے ہیں جاگتے ہیں اور جس چیز پر ان کا جی آتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اپنے نفس کے اتباع میں ہر قسم کی من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ حق و صداقت کا کوئی تقاضا ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ جانور بے چارے تو عقل اور شعور کی کمی کی وجہ سے ایسی غیر ذمہ دارا نہ حرکات کرتے ہیں لیکن انسان فہم و ادراک رکھنے کے باوجود جانوروں کی سی روش اختیار کرتا ہے اور

اسی وجہ سے وہ جانوروں کی سطح سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دین سے انحراف کی طویل راستان کا اگر نبطرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ منکالت اور گمراہی کے علمبردار یہی طبقے ہیں جن کا اُپر ذکر کیا گیا ہے اور گمراہی جب بھی آتی ہے تو ان راستوں ہی سے آتی ہے جن کی نشاندہی کی گئی ہے یہاں ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اچھے بھلے ہوشمند انسان حق و صداقت کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ باطل میں آخر وہ کونسی ایسی جاذبیت ہے جو انسانوں کے قلب و دماغ کو مفتوح کر کے انہیں اُس کا تابع بنا دیتی ہے۔ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ مادی زندگی کے مفادات جنہیں وہ جدید اصطلاح میں وقت کے تقاضے کہہ دیتا ہے، اُسے صراطِ مستقیم سے ہٹاتے ہیں۔ یہ مفادات انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اور اجتماعی بھی لیکن جن چیزوں کو وہ عصری تقاضوں کے نام سے یاد کرتا ہے وہ بہر حال ہوتے مادی مفادات ہی ہیں۔ جب تک کسی قوم کے اندر مذہب کی بالادستی قائم رہتی ہے اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق مذہبی اصولوں سے ہٹ کر کوئی طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی اسوقت تک یہ مفادات مذہب کے تابع رہتے ہیں اور انسان کو اپنا پرستار نہیں بنا سکتے لیکن ان کے مقابلے میں جب دنیا کی محبت آخرت کے خوف پر غالب آجاتی ہے، جب اُن دیکھے خدا پر ایمان کی بجائے عالمِ محسوسات پر یقین بڑھ جاتا ہے جب دنیوی لذات روحانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنے لگتی ہیں تو پھر وہ مذہب کو ان مادی مفادات کی بھینٹ پڑھا دیتا ہے۔ فکر و نظر کی یہ ہمہ گیر تبدیلی دفعہ واقع نہیں ہو جاتی۔ یہ انقلاب بڑے غیر محسوس طریقے سے آتا ہے اور آغاز میں اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے لیکن اس سے مذہب اور دین پر دنیاوی مفادات پوری طرح مسلط ہو جاتے ہیں اور مذہب کی حیثیت اُس وقادار اور اطاعت شعار غلام سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جس کا نہ اپنا کوئی ضمیر اور ایمان ہو اور نہ اپنی کوئی رائے بلکہ جس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے آقا کے ہر حکم کی بغیر

کسی اور نئی تامل کے تعمیل ہو۔

مذہب دنیاوی مفادات کا تابع بن کر کس طرح بگڑنا اور اپنی افادیت کھود دیتا ہے اس کے لیے ہم صرف ایک مذہب مسیحیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سے پوری حقیقتِ حال سامنے آ جائے گی دین مسیحیت آغاز میں بالکل اللہ کا ایک سچا دین تھا جو بنی نوع انسان کی بھلائی اور اخروی نجات کے لیے باری تعالیٰ نے تین دنوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ یہ دین اپنے اصول و مبادی اور اپنے مزاج میں سراسر خیر تھا اور دنیا میں شہر کو مٹانے اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کروانے کے لیے اس کا پرچار کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسے اپنایا ان کی زندگیاں اطاعتِ باری کا نہایت اعلیٰ نمونہ بن گئیں۔ اس سے دکھی انسانیت نے سکھ اور چین حاصل کیا۔ کمزور اور پسے ہوئے طبقوں نے اپنے اصل مقام کو پہچانا اور دنیاوی لذات میں کھوٹے ہوئے انسان اخلاق اور روحانیت کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے لذت آشنا ہوئے۔

مگر بڑا ہومادی مفادات کا کہ بعض طبقوں نے مذہب کے نام پر انہیں حاصل کرنا شروع کیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام دینی تعلیمات کو جوں کا توں رکھتے ہوئے تو نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان تعلیمات میں من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوا جس نے بالآخر تحریفیات کی گھناؤنی صورت اختیار کر لی اور اس طرح دین، خود دینی طبقوں کے ہاتھوں برباد ہو کر رہ گیا۔ رہبانیت، دین اور دنیا کی تفریق۔ مذہب کی امور دنیا سے بے تعلقی اور راہبوں کی غیر مشروط پیروی اور بت پرستی اور غیر اللہ کی پرستش اسی دور کی پیداوار ہیں۔

مسیحیت کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اس کا دائرہ سکرٹنے لگا اور دنیاوی زندگی کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنے کے لیے باطل نظریات گھڑے جانے لگے۔ دین اور دنیا کی روٹی کا تصور وہ پہلا مرحلہ تھا جس نے مذہب کو ایک بے جان قوت بنا کر رکھ دیا اور انسان

کو یہ جرات ہوئی کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے بے نیاز ہو کر جس طرح چاہے تشکیل دے۔ جوں جوں اس تصور نے زور پکڑا یورپ کی پوری زندگی دو مختلف دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک وہ دھارا جس میں روحانیت، اخلاق اور مذہب کے اجزا شامل تھے اور وہ انسان کے قلب اور روح کو سیراب کرتا تھا اور دوسرا وہ دھارا جس میں سوائے مادی مفادات کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی اس دھارے سے انسانوں کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی کی آبیاری ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں فکری اور عملی تضاد کے بڑے بڑے روح فرسا مناظر سامنے آنے لگے۔ ایک طرف راہب اور پادری کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر عشق الہی میں محو ہو کر خالص روحانی کیفیت و سرور سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر عبادت گاہوں کے باہر تمدن و سیاست میں، معیشت و معاشرت میں تعلیم اور عین الاقوامی معاملات میں سوائے مفادات کی حکمرانی کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دنیاوی مفادات پر ہر چیز کو قربان کر دیا تھا۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زندگی کا یوں نقشہ کھینچا ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُوجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا
بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأْنٰنُوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ
هُمْ عَمَّاۗ اٰتَيْنَا عُضْلُوْنَ - اُولٰٓئِكَ مَا لَهُمْ
النَّامُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ -

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر ہی راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے کرتے رہے ہیں۔

پھر ان میں سے ہر شخص کی اپنی انفرادی زندگی بھی عجیب و غریب تضاد کا شکار ہوئی وہ لوگ جو مذہبی داترے کے اندر بڑی نیکی، خدا ترسی اور پرہیزگاری کے دعویدار تھے وہ بھی اجتماعی معاملات میں بڑے ظالم خود غرض، سفاک اور بے اصولے ثابت ہوئے اور انہوں نے معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو عام انسانوں کے لیے عذاب بنا دیا۔

دین اور دنیا کے درمیان یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی چلی گئی۔ دنیاوی مفادات نے دینی مفادات کے دائرے کو اتنا تنگ کر دیا کہ دین صرف عبادت گاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا لیکن اپنے مقام پر اس کا بہر حال ایک وزن تھا اور عوام اُس کے فیصلوں کو عقیدت و احترام کے طے جملے جذبات کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اگرچہ دین کے ان فیصلوں کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے پر قدرت تو نہ رکھتے تھے مگر دینی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کرنا بھی اُن کے بس میں نہ تھا۔ اس سے اُن کے ذہنوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ یہی وہ عہد تھا جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اشیاء کی کثیر پیدا آوری اور زود پیدا آوری کے لیے اس سے کام لینا شروع کیا اور اس سے نئے نئے معاشی، سیاسی اور معاشرتی تقاضے جنم لینے لگے۔ اہل یورپ کے لیے یہ ایک زبردست آزمائش کا وقت تھا۔ وہ ایک ایسے اہم مقام پر لاکر کھڑے کر دیئے گئے تھے جہاں انہیں مذہب کے بارے میں آخری اور قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو صنعتی انقلاب کو ایک ایسے ہنچ پر ڈال سکتے تھے جس سے مذہبی اقدار برباد نہ ہوتیں بلکہ یہ صنعتی ترقی ان کے تابع رہ کر انسانیت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہوتی اور اس سے وہ انفسانک نتائج پیدا نہ ہوتے جو آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسے انسانیت کی سیاہ بختی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اہل یورپ نے اس فیصلہ کن مرحلے میں بڑا غلط فیصلہ کیا اور محض مادی مفادات کو وقت کے تقاضے سمجھ کر مذہب کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔

جن مسائل کو یہ لوگ عصری تقاضے کہتے ہیں وہ کوئی ایسے قوانین تکوینی نہیں جن سے انسان کو کوئی مفر نہ ہو بلکہ یہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے وہ مختلف انداز ہیں جنہیں انسان اپنی منشا اور مرضی کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اگر یورپ میں چند انسانوں کو اس بات کی کھلی چھٹی مل گئی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں غریبوں کا خون نچوڑ کر دولت جمع کریں اور اس طرح امیر اور غریب طبقوں کے درمیان کشمکش پیدا ہو تو معاشرے کے اندر لوگوں نے یہ ظالمانہ روش کسی غیر اختیاری محرک کی وجہ سے مجبوراً

اعتیار نہ کی تھی بلکہ چند مفاد پرست طبقوں نے محض اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے عوام کو اس غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اور وہ بیچارے جب ان مصائب سے تنگ آکر اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا کہ تمہیں یہ ساری پریشانیوں اور بربادیاں خوشدلی کے ساتھ برداشت کرنی چاہیں کیونکہ یہ وقت کے تقاضے ہیں گو یا کہ سارا ظلم و استبداد نوشتہ تقدیر ہے جسے کسی صورت بھی بدلا نہیں جاسکتا۔

عصری تقاضوں کے فتنے یوں تو پیشتر ہی لیکن ہم صرف ان کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے پیشتر مسیحی معاشرے میں بے جان سکوں کے مقابلے میں انسان کی قیمت کہیں زیادہ تھی لیکن اس انقلاب کے بعد جب دولت پرستی کا جنون پیدا ہوا تو انسان کی قدر کم ہونے لگی اور اس کی جگہ سکوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور انسان نے وہ سارے حربے استعمال کرنے شروع کیے جن سے وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے موثر ہتھیار سود تھا لیکن بائبل اسے کسی طرح بھی جائز قرار نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ اصول طے کیا گیا کہ مذہب کو تجارتی معاملات میں دخل نہ ہونا چاہیے اور پھر عوام کے ذہنوں میں یہ بات آہستہ آہستہ بٹھائی جانے لگی کہ بائبل جس سود کی حرمت کا فتویٰ صادر کرتی ہے وہ تجارتی قرضوں کا سود نہیں بلکہ وہ زائد رقم ہے جو کسی ضرورتمند کی مجبوری اور لیے بسی کے پیش نظر اس سے وصول کی جاتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں سے سود کی حرمت کا احساس مٹتا چلا گیا۔

انسان کی قدر و منزلت کم ہونے اور دولت کا احترام بڑھنے کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ دنیا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو گئی اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے برسرِ پیکار ہونے لگا۔

اہلِ یورپ صنعتی انقلاب سے پیشتر جس مذہب سے آشنا تھے اس نے انسان اور انسان کے درمیان بھائی چارے کے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ خدا بندوں سے جب بھی معاملہ کرتا ہے تو وہ

نسلی اور وطنی بنیادوں پر نہیں کرتا بلکہ خالص انسانی بنیادوں پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام الہامی مذاہب نے خاک و خون کے اختلافات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جن لوگوں نے ان اختلافات کو ابھارا ہے ان کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ مذہب ہر دور میں انسان کو انسان سے قریب لانے کا سب سے موثر ذریعہ رہا ہے۔ یورپ میں انسانوں کے درمیان بعد ویرجنگنگی کا احساس صنعتی انقلاب سے پہلے اگرچہ کسی حد تک شروع ہو چکا تھا لیکن وہ چونکہ سارے ایک چرچ کے تابع اور ایک روحانی پیشوا کے مطیع اور فرمانبردار تھے اس لیے ان کے اندر کسی حد تک اخوت کا تعلق بھی پایا جاتا تھا۔ مگر اخوت کا یہ رشتہ دولت پرستی کے مجنونانہ جذبہ مسابقت میں مانع تھا۔ دین کے سارے ممالک کے دو متمذ طبقوں کو صرف ایک فکر ہی کھائے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح اس دور میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں اور دنیا کی ساری دولت خود اکٹھی کر لیں۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ان عیار طبقوں نے اپنے اپنے ملک کے عوام کو بیوقوف بنایا اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ ان کی محبت و عقیدت کا مرکز صرف ان کا اپنا وطن ہونا چاہیے۔ جو لوگ دوسرے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں وہ ان کے دشمن ہیں اور انہیں سوائے ان کے خلاف نفرت اور حقارت کے اپنے اندر کوئی دوسرا احساس پیدا نہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں دنیا سے مٹانے اور نیست و نابود کرنے کی مختلف تدابیر سوچنی چاہئیں اس طریق سے دولت پرستی نے قوم پرستی کو جنم دیا اور مادی مفادات نے قومی تقاضوں کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب اس نقطہ نظر سے مذہب کے اندر بھی تبدیلیاں کی جانے لگیں۔ اس ضمن میں عوام کے اندر یہ احساس ابھارا گیا کہ آخر یہ کیا حماقت ہے کہ ایک شخص پوری دنیا کی مسیحیت کا روحانی پیشوا ہے جب ہر ملک کے مفادات اور تقاضے الگ ہیں، جب ہر ملک کی اپنی الگ ضروریات ہیں تو لازمی طور پر ان کا مذہب بھی الگ اور جداگانہ ہونا چاہیے اور ان کی مذہبی تنظیم بھی ان کی اپنی حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو مذہب کو ان کی اپنی قومی اور وطنی ضروریات کے مطابق ڈھال سکے۔ اس طریقہ فکر کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ پوری دنیا سے مسیحیت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور وہ مرکزیت ختم ہو گئی جس نے مذہب کی عملداری کو کسی حد تک قائم کر رکھا تھا۔ اب ہر حکومت نے اپنی براہ راست نگرانی میں اپنی

ضروریات کے مطابق مذہبی نظام قائم کیے۔ حکومت چونکہ دولت مند طبقوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے مذہب کی تشکیل نو عملاً دولت پرستوں کے رجحانات کے عین مطابق کی گئی اور اس میں ان کے مافی مغاڑا کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ مذہب کی آزاد اور عاقلانہ حیثیت ختم ہو گئی اور اب وہ بادشاہوں، بربر اقتدار طبقوں، معاشرے کے بااثر افراد اور بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس نئے مذہب نے انسانیت کے مقدس رشتوں کو منقطع کر کے ان کی جگہ نفرت و حقارت کے بیج پوسے اور اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ ملک کے مفاد پرست طبقوں کی پشت پناہی کے لیے تو سے دیتا رہے۔ مذہب کے علمبردار جن کی طرف عوام ہدایت اور رہنمائی کے لیے رجوع کیا کرتے تھے وہ حکومت اور اصحاب اقتدار کے ایجنٹ اور آلہ کار بن گئے۔ عوامی مسائل اور غریب طبقوں کے دکھ درد یا حکومت کی ریشہ و رانیوں اور دست درازوں سے اب انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کی زندگی کا اب ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ملک کے دولت مند طبقوں کے مفادات کی ہر طریق سے حفاظت و پاسانی کریں۔ مذہبی تعلیمات میں تحریفات کرنے والوں کی بڑی پذیرائی ہونے لگی اور جو شخص اس معاملے میں جتنا زیادہ بری اور میناک تھا اور اصحاب اقتدار کے ذوق کے مطابق دین کو ڈھالنے میں جتنی زیادہ ہنرمندی اور چابکدستی دکھا سکتا تھا اسی نسبت سے وہ چرچ کے اندر اونچے مناصب پر فائز کیا جانے لگا۔ اس نئے مذہبی طبقے نے مذہب کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ قوم پرستی کے لیے باطل احساسات فراہم کیے، مذہب کو حکومت کا تابع کیا، خدا ترس، آزاد اور حق و انصاف کے علمبردار اہل کلیسا کی جگہ مذہبی تنظیمات کی باگ ڈور بھی خالص مفاد پرستوں کے ہاتھ میں دے دی جنہوں نے مذہبی مرکزیت کو برباد کیا اور مذہب کے حیات آفریں اصولوں کو بدل کر ان کی جگہ ایسے اصول داخل کیے جن سے سوائے مفاد پرستی کے اور کسی جذبہ کو تقویت نہ پہنچتی تھی۔ اوقاف کی بے پناہ دولت مذہب کی توسیع و اشاعت پر صرف ہونے کے بجائے حکومتوں کے پروپیگنڈے پر بے دریغ خرچ ہونے لگی۔ یہ حضرات آغاز میں تو بے حد خوش تھے کہ چلیے پاپائے روم کی غلامی سے تو نجات ملی لیکن جب انہیں مفاد پرست اصحاب اقتدار کی غلامی کا طوق پہننا پڑا تو اس وقت انہیں اپنی

یہی اور تکلیف کا احساس ہوا۔ جو لوگ ان میں ذرا باضمیر اور حساس تھے ان پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا اور جنہوں نے ان اصحاب اقتدار کے طرز عمل کی تائید کرنے میں ذرا بخل سے کام لیا انہیں مختلف ازیتیں دے دے کر مارا گیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں پاپائے روم کی دراز دستیوں کی داستانیں محفوظ ہیں لیکن اگر وہ قومی کلیسا کے علمبرداروں کے مظالم کا مطالعہ کریں تو ان کی ہوننا کیا کسی طرح بھی رومی کلیسا سے کم نہ تھیں۔ پھر پاپائے روم اگر مذہب کے اندر کوئی تحریف بھی کرتا تو وہ پوری دنیا سے عیسائیت کے مفاد کو سامنے رکھ کر یہ جبارت کرتا لیکن قومی کلیساؤں نے تو اس معاملے میں دیانت اور امانت کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف قومی تقاضوں کے مطابق ہر طرح کی تاویلات بلکہ تحریفات کرنا شروع کیں۔ چنانچہ مذہب کی حیثیت ایک رہنما قوت کی حیثیت سے بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ مذہب اب ایک مرغِ باد بنا تھا جسے مفادات کے تھپیرے، جنہیں عوام کو فریب دینے کے لیے قومی تقاضے یا زیادہ خوش کن الفاظ میں عصری تقاضے کہا جاتا تھا جس طرف چاہتے گھا دیتے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی بے جان اور غیر موثر چیز دنیا میں کب تک زندہ رہ سکتی تھی، اس لیے عوام نے جلد ہی اس کا قتلہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ مفاد پرستی کے دور میں اس کی اگر کچھ افادیت باقی رہ گئی تو وہ اس قدر تھی کہ استعمار پسند قومیں جب مادی مفادات کے حصول کے لیے کمزور اقوام پر یلغار کریں تو مذہب کے علمبردار استعمار کے ٹھنڈ کی حیثیت سے ان مظلوم قوموں کے اندر لفاق پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور اس طرح سامراجی عزائم کی تکمیل کا موثر ذریعہ ثابت ہوں۔

ملتِ اسلامیہ کی یہ انتہائی بد نصیبی ہے کہ عصری اور قومی تقاضوں سے اس کے بہی خواہ بھی اب بڑے مرعوب ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں سے کتنے تقاضے ایسے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ حالات کا مطالعہ تو یہ ثابت کرتا ہے کہ دورِ حاضر کا ایک تقاضا بھی ایسا نہیں جو قانونِ تکوینی کی طرح اٹل ہو اور جس سے کوئی مغر نہ ہو۔ یہ

نام نہاد تقاضے خود اہل مغرب کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انہیں جنم دیا اور پھر ان کے اندر جاؤ بیت پیدا کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ وقت کا تقاضا ہیں۔ مثلاً جب مسلک انفرادیت پسندی میں فائدہ نظر آیا تو اسے وقت کا تقاضا کہنا شروع کیا اور جب اجتماعیت میں مادی فوائد حاصل ہونے کے روشن امکانات نظر آئے تو اسے وقت کا تقاضا کہہ دیا۔ اور قومی ملکیت کا پرچار شروع کر دیا۔ جب عوام پر قوم پرستی کا جنون سوار کر کے اپنا مطلب نکلتا ہو تو وطن کو معبود بنا لیا اور اگر کمزور کو لوٹنے کے لیے چند قوموں کا اشتراک ضروری معلوم ہوا تو پھر آئیڈیالوجی کی حکمرانی کا نعرو لگانا شروع کیا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہمارے پیش نظر کوئی قومی مفادات نہیں بلکہ انسانیت کی خیر اور بھلائی ہے۔ آخر خود غور کیجئے کہ وہ کونسا ایسا عصری تقاضا ہے جسے قوموں نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ان تقاضوں کے علمبردار انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جب چاہتے ہیں انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں تو آخر ہمارے لیے یہ کیوں اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کی خاطر اللہ کے دین کو بدلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ خالق جس نے انسان اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے جو علیم وخبیر ہونے کی وجہ سے انسان کے ہر چھوٹے بڑے تقاضے کو اچھی طرح جانتا ہے، اُس کی نظر میں اگر ہمارے عہد کے تقاضے اتنے شدید ہوتے کہ ہم اُس کی نازل کردہ تعلیمات کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے تو وہ ہمیں یہ بشارت کبھی نہ دیتا:

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ
اتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَصَيِّتُ
لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا۔
(المائدہ: ۴)